© rasailojaraid.com

محمد حنیف ندوی

توحید اور اقدارِ حیات

(۳)

فکر و نظر کو جلا دینے اور کائنات کے بارہ میں صحیح متوازن اور علمی اسلوب عطا کرنے کے علاوہ نظریہ توحید کی افادیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت و عشق کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان ایسے لطائف، ایسے انوار و تجلیات اور مقامات سے دوچار ہوتا ہے کہ جو ترقی و معراج کے نئے نئے دریچوں کو کھول دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ توحید کے اس پہلو کو ہم متصوفانہ (MYSTICAL) پہلو قرار دیں گے۔

افسوس ہے کہ ہمارے متکلمین نے توحید کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں محبت و عشق کے اس انداز کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ یہی اصل دین اور روحِ دین ہے۔ اس کے بغیر جو کچھ ہے، وہ یا تو عقل و خرد کی خشک ترکتازیاں ہیں اور یا پھر ادنیٰ قسم کے شرک کی نفی ہے جو کسی طرح بھی توحید کامل کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی، اس طرح کی توحید سے دنیائے دل میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، کوئی لگن بیدار نہیں ہوتی۔ کوئی نصب العین متعین نہیں ہوتا۔ اور کوئی ایسی روشنی نہیں ابھرتی کہ جس کے بل پر انسان تکمیل ذات اور ارتقائے ذات کی راہوں پر گام فرسا ہو سکے۔ یا دل کی وسعتوں اور پہنائیوں کا جائزہ لے سکے، اور یہ جان سکے کہ نفس و روح کی گہرائیاں علم و عرفان کے کن کن انمول امکانات کو اپنے دامن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھپلے ہوئے ہیں۔

اب تک ہم نے جو علوم و فنون میں ترقی کی ہے۔ تہذیب و تمدن کے حسین و جمیل پہلوؤں کو نکھارا ہے اور انسانی فتوحات کے دائروں کو وسعت بخشی ہے تو یہ سب فکر و عقل کا کرشمہ اور تجربہ و تحقیق کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ روح و قلب کے مضمرات ارتقاء کی حدود کہاں سے کہاں تک وسیع ہیں اور اس کی حدود سے ہم تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں کو کس درجہ سنوار سکتے ہیں۔ کس درجہ انسانیت کے ہمہ گیر تقاضوں سے قریب تر کر سکتے ہیں۔ اس کا تعلق فکر و نظر کی بجائے سراسر اس حقیقت سے ہے کہ ہم نے اپنے باطن میں ڈوب کر کیا دیکھا ہے، اور ایک محبوب، ایک کامل اور ایک پیکر حسن و جمال سے تعلق پیدا کر کے کیا محسوس کیا ہے۔ کس درجہ روشنی پائی ہے۔ کس درجہ پاکیزگی حاصل کی ہے۔ اور دل بے تاب کے لیے سکون و طمانیت کی کتنی بڑی مقدار سمیٹ لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تہذیب و تمدن کے داعیے اس وقت تک پورے ہونے والے نہیں جب تک علم و فن کے پہلو بہ پہلو عرفان و سلوک کی وادیوں کو طے نہ کیا جائے اور توحید کے اس متصوفانہ پہلو کو آزمایا نہ جائے جو انسانی تگ و تاز کے لیے منزل کی تعیین کرے۔ اور خصوصیت سے موجودہ دور کے تنگ نظر انسان کو اس فرازِ اعلیٰ اور وسیع تر افقِ حیات تک اچھال دے جو اعمال کو اقدار کے ہمہ گیر انسانی سانچوں میں ڈھال دے اور ذات، وطن، اور رنگ و قوم کی آلائشوں سے داغ دار نہ ہونے دے۔ قرآن حکیم نے توحید کے اس متصوفانہ پہلو پر متعدد آیات میں روشنی ڈالی ہے۔ جن میں محبت و عشق کی کیفیتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (بقرہ ۱۶۵)

"بعض لوگ ایسے ہیں جو بجز خدا کو خدا کا شریک بناتے ہیں اور ان سے خدا کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا ہی کو بہت زیادہ دوست رکھتے ہیں۔"

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (انشقاق ۶)

"اے انسان تو اپنے پروردگار کو پالینے کے لیے خوب کوشاں ہے سو تو اس کو پا کے رہے گا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وان الی ربک المنتہیٰ (النجم ۴۲)

"اور یہ کہ تمھیں اپنے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے۔"

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ (عنکبوت ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہمیں پانے کی کوشش کی۔ ہم انھیں ضرور اپنی راہوں سے آشنا کرکے رہیں گے۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں دو چیزیں صراحت سے مذکور ہیں۔ ایک یہ کہ توحید و شرک کا معاملہ صرف عقیدہ و نظریہ کا معاملہ نہیں۔ بلکہ محبّت و تودد کا معاملہ ہے۔ بت پرست حضرات صرف بتوں سے مرادیں ہی نہیں مانگتے۔ صرف نذر و نیاز کے تحفے ہی اصنام کے بھینٹ نہیں چڑھاتے اور صرف غیر اللہ کے سامنے سجدہ و رکوع ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ ان سب حرکات کی تہ میں ان کی محبّت و توقیر کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور یہ سب اعمال اسی محبّت کا نتیجہ ہیں۔ اس بنا پر ان کا اصل گناہ یا معصیت یہی ہے کہ محبّت کی یہ دولت جس کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہونا چاہیے تھا اس کو انھوں نے دوسروں کے لیے روا سمجھ رکھا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک بُت پرست کے دل میں غیر اللہ کے لیے جس درجہ محبّت، توقیر اور احترام و عشق کا جذبہ موجود ہوتا ہے، ایک مومن کے دل میں اس سے کہیں بڑھ کر شدید جذبہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہونا چاہیے۔

سورۂ انشقاق کی یہ آیت اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کی ہر تگ و دَو، اور زندگی کی ہر کوشش و کاہش بالآخر اسے موت کے قریب تر لے جانے والی ہے۔ اور موت کے بعد ایک دن آنے والا ہے، جب اسے چار و ناچار اپنے پروردگار کا سامنا کرنا، اور اس کے حضور کے پیش ہونا ہے، لہٰذا کیوں نہ سعی و تگ و دو کے اس نقشہ کو عشق و محبت کی روشنی میں اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ یہ "ملاقات" اور یہ سامنا ہماری زندگی کا عزیز ترین نصب العین قرار پا جائے۔ ہم اسے دل سے چاہیں، اس سے دل سے محبّت رکھیں اور مہجوری کے عالم میں جب تک ہم دنیا کے اس خرابہ میں رہنے پر مجبور ہیں اس کے ذکر اور اس کی یاد سے دلِ ویراں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو آباد کرنے کا اہتمام کریں۔

سورۂ نجم کی آیت واضح طور پر اس مضمون پر دلالت کناں ہے کہ ہماری منزلِ شوق اور ہمارے سفرِ محبّت کی انتہا، اور پروردگار کی ذات گرامی ہے۔ اسی کی ربوبیت ہماری ہستی کا نقطۂ آغاز ہے، اسی کی محبت ہمارے سفرِ روحانی کا نقطۂ آخر۔

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی نمایاں اشارہ ہے کہ یہ محبّت کوئی مجہول قسم کا جذبہ نہیں کوئی بیکار قسم کا تاثر یا انفعال نہیں بلکہ ہماری زندگی کے لیے منزل و سفر کی تعیین کرنے والی ہے اور ہمارے لیے اخلاق اور معاملات وغیرہ کے مخصوص سانچوں کو ڈھالنے والی ہے۔

سورۂ عنکبوت کی آیت میں اللہ کی راہ میں سفر کرنے والوں کے لیے یہ مژدہ جاں فزا پنہاں ہے کہ محبّت ہی کا یہ پاکیزہ جذبہ جہاں مجاہدہ جذبہ مجاہدہ چاہتا ہے، ریاضت کا طالب ہے اور ایثار و محنت کا مقتضی ہے وہاں خود رہنما اور مرشد بھی ہے۔ اس حقیقت کو فلسفہ کے اندازِ بیان میں ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے روزمرہ کے معاملات میں غیر متعلق عنصر (INDIFFERENT) کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسی شفیق و مہربان ذات کی ہے جس کو ہماری زندگی اور چلن سے پوری پوری دلچسپی ہے۔ اگر ہم اس کی طرف لپکیں، اس کو پانے کے لیے جد و جہد اور سفرِ روحانی کا آغاز کریں تو ہم دیکھیں گے کہ قدم قدم پر اس کا فضل اس کی عنایت اور مہربانی ہمارے شامل حال ہے اور کسی طرح ہم اس سفر میں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں۔

معتزلہ کی یہ کوتاہ نظری اور کور ذوقی تھی کہ وہ توحید کے اس گراں مایہ راز کو پا نہ سکے ان کی تمام تر توجہ بس اسی بات پر مرکوز رہی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے عقلی پیمانے ڈھونڈے جائیں اور اس کی تشریح و وضاحت کے سلسلہ میں تنزیہ و تجرید کا ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ جس میں جسمانیت کا کوئی شائبہ نہ ہو، جس میں بشریت کی کوئی آلائش نہ ہو یعنی بحیثیت مجموعی اس کی قامتِ زیبا کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اس پر الفاظ و حروف کا کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامہ کبھی راست نہ آسکے۔ ان کے نزدیک توحید کے معنیٰ صرف تنزیہ، صرف تقدیس اور تجرید کے ہیں۔ مگر اس فلسفیانہ قیل وقال سے جو اپنی جگہ معقول سہی، اور کسی حد تک ضروری بھی، جذبۂ شوق کی کب تسکین ہوتی ہے۔ اور اس کھری، بے جان اور خشک توحید سے قلب و باطن میں وہ روشنی، وہ بالیدگی اور وہ تپش اور آگ کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے کہ جو سرمایۂ حیات ہے۔ قرآن حکیم کے لفظ سے توحید کے اولین دائرۂ اطلاق میں محبّت الٰہی اور تعلق باللہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے اس کے نزدیک رجحانِ ذوق کے اعتبار سے انسانوں کی ایک ہی تقسیم ہے۔ یا تو وہ "اند اداً من دون اللہ" کا پجاری ہے اور یا پھر اس کا دل محبّت الٰہی سے معمور ہے۔ اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ ایک شخص اللہ کا دوست بھی ہو اور اس کے سوا دوسری اشیا سے بھی محبّت و تعلق خاطر قائم رکھے۔ شہبازِ توحید اور زاغِ شرک بھلا ایک ہی آشیانے میں کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک خدا کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہمارا محبوب ایک ہے۔ ہمارا مرکزِ عشق ایک ہے اور ایک ہی وہ ذاتِ گرامی ہے جس نے قلب و نگاہ کی تمام تر توجہات کو گھیر رکھا ہے۔

توحید کے اس متصوفانہ پہلو کو صوفیاء نے سمجھا ہے۔ سمجھا ہی نہیں اس کو جذبہ و دل میں اچھی طرح سمونے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایام حج میں اہل دل کے ایک حلقہ میں محبّت کے بارہ میں بات چل نکلی۔ حضرت جنیدؒ سے رجوع کیا گیا۔ یہ ان دنوں نسبتہً کم عمر تھے۔ انھوں نے گردن تھوڑی سوچ بچار کیا، اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ فرمایا:۔

"محب اس بندے کا نام ہے جو گو اپنے نفس سے دور ہو لیکن ذکر رب کے قریب تر ہو، جو اپنے رب کے حقوق و فرائض ادا کرنے میں کوشاں ہو، جو اس کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی ہو۔ جس کے دل کو اس کی ہیبت وجلال کے انوار نے جلا رکھا ہو، جس نے اپنے پیمانہ و سبو کو اس کی محبّت صافی سے بھر رکھا ہو۔ جس کے سامنے غیب کے پردے چاک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں۔ اور جو اگر گفتگو کرے تو تکلم باللہ قرار پائے، بولے، تو نطق من اللہ کہلائے۔ اور اگر حرکت و جنبش کرے تو امر اللہ کے تحت [1]

توحید محبوب کے اسی تصور سے متاثر ہو کر سلطان العاشقین ابن الفارض نے کہا:-

وحياة اشواقی اليك وحرمة الصبر الجميل

ما استحسنت عينی سواك ولا صبوت الی الخليل [2]

"مجھے شوق و تمنا کی پوری زندگی کی قسم، بلکہ اس صبر جمیل کی قسم۔ جس کو میں نے تیری راہ میں اختیار کیا، میری چشم آرزو نے تیرے سوا کبھی کسی کو پسند نہیں کیا۔ اور نہ میں نے تیرے سوا کسی کو دوست بنایا"

وحدت محبوب کے اسی عقیدہ نے آگے چل کر وحدت الوجود کی شکل اختیار کرلی یعنی صوفیا نے جب ذات حق تعالیٰ کو اپنی والہانہ کیفیتوں کا مرکز مانا تو ان کی غیرتِ عشق نے کسی طرح بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی دوسری شے کسی درجہ میں بھی اس داعیہ عشق میں شریک ہو۔ وحدت الوجود کا مسئلہ، بلاشبہ ایک فلسفہ حیات رکھتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا اصلی اور بنیادی تعلق آفرینش کائنات کے بارہ میں ایک خاص نقطۂ نظر کی وضاحت ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں تک اس کے منطقی لوازم کا تعلق ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان ارادہ و اختیار کی نعمتوں سے محرومی اختیار کرلے، اور اپنے کو اس وسیع تر نظام کا محض ایک بے جان کل پرزہ تصور کرے۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ صوفیا نے بھی اسے اسی فلسفیانہ حیثیت سے قبول کیا ہو، اور اس نے انہی منطقی نتائج کو اخذ کیا ہو۔ ہمارے نزدیک صوفیا کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ عقل و فکر کی طرفہ طرازیوں سے نہیں، احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فلسفۂ آفرینش سے زیادہ عشق و محبت الٰہی کی کیفیات سے متعلق ہے۔ صوفیاء جب

---

[1] نفح الطیب؟ نشر المحاسن ج ۱، ص ۲۳۳ بحوالہ التصوف الاسلامی فی الادب و الاخلاق۔ احمد زکی مبارک

[2] التصوف الاسلامی ج ۱، ص [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"لاموجود الا ھو" کہتے ہیں تو اس کے معنیٰ صرف یہ ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی شے بھی مستحق توجہ نہیں، کوئی شئی بھی شائستہ التفات نہیں، اور کوئی شئی بھی ایسی نہیں کہ دیدۂ دل کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اور اس کا ثبوت خود ان کی کتاب زندگی ہے، ان کی سیرت ہے۔ اور یہ احتیاط ہے کہ ان کا کوئی قدم بھی خلاف شریعت نہ اٹھے، یہی نہیں، قلب و ذہن کا کوئی وارد اور خیال بھی ایسا نہ ہو جو منشا الٰہی کے خلاف پڑے۔ اور تو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کے ہاں اشعار اور بعض عبارات میں جبر کے معنیٰ اس ملحدانہ جبر کے ہوں کہ جس کے مان لینے کے بعد اخلاق کی ذمہ داری یک قلم ساقط ہو جاتی ہے۔ بلکہ جبر بھی ان کے ہاں کامل رضا اور خود سپردگی کی ایک کیفیت سے تعبیر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سالک ترقی احوال میں ایسی کیفیت اور حال سے دوچار ہوتا ہے، جہاں یہ اپنے اختیارات سے بالکل دست بردار ہو جاتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس کی اپنی نیکی کو اپنی خوبی اور اپنا عمل اس کا اپنا نہیں بلکہ خدا کی دین ہے، پروردگار کی بخشش ہے۔ اسی طرح دکھ، تکلیف اور شر کی جو مقدار اس کائنات میں رونما ہے اور جس سے روزانہ ہمیں سابقہ پڑتا ہے اس میں بھی چشم یار کا اشارہ ہے۔ لہٰذا جزع فزع کی بجائے شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کی ذات ادھر ملتفت تو ہے؟

© rasailojaraid.com